AL-AASAR Journal Vol. 3, No. 1 (2026)
Quarterly *Research Journal* Online ISSN: 3006-693X
www. al-aasar.com Print ISSN: 3006-6921

قراردادِ مقاصد(1949ء)اور علماء کا متّفقہ تاریخی اِتّحاد:ایک تحقیقی جائزہ

The Objectives Resolution (1949) and the Historic Consensus of Islamic Scholars

(1) Palwasha Mehsud[1] (2) Abdullah[2]
Palwasha mehsud@gmail.com abdullah.jan.buner12@gmail.com

Abstract:

This study explores the historical and constitutional significance of the Objectives Resolution (1949) and the unanimous Twenty-Two Constitutional Principles formulated by thirty-one eminent Islamic scholars in 1951. It examines how the Objectives Resolution laid the ideological foundation of Pakistan by affirming the sovereignty of Allah, democratic governance, fundamental rights, and Islamic constitutional values. The study further argues that the Twenty-Two Principles were a later scholarly effort to provide a practical constitutional framework rather than the basis of the Objectives Resolution. Using historical and analytical methods, the research analyzes parliamentary debates, constitutional documents, and authentic historical sources. It concludes that both the Objectives Resolution and the consensus of thirty-one scholars made a lasting contribution to Pakistan's constitutional development and significantly influenced the Constitutions of 1956, 1962, and 1973. These documents remain fundamental to understanding the Islamic constitutional identity of Pakistan.

Keywords: Objectives Resolution, Constitution of Pakistan, Twenty-Two Principles, Islamic Constitutional Thought, Thirty-One Islamic Scholars.

تمہید

پاکستان کا قیام بیسویں صدی کے ان اہم سیاسی واقعات میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے جنوبی ایشیا کے سیاسی، سماجی اور آئینی منظر نامے کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیا۔ برِصغیر کے مسلمانوں نے ایک جداگانہ ریاست کے حصول کے لیے طویل جدوجہد اس اُمید کے ساتھ کی کہ وہ ایسی مملکت قائم کریں گے، جہاں اُن کی مذہبی، تہذیبی ، تمدنی اور قانونی شناخت محفوظ رہے اور اجتماعی زندگی قرآن و سنت کے اصولوں کے مطابق منظم بسر کی جاسکے۔

پہلی بار ٹھوس بنیادوں اور مضبوط دلائل کے ساتھ مسلم ریاست کا تصور علامہ اقبال نے 1930ء میں اپنے تاریخی خطبہ ٔالہ آباد میں پیش کیا تھا۔ چودھری رحمت علی نے اس تصور کو پاکستان کا نام دیا اور پھر اپنے دوستوں کی مدد سے اس نام کو عام کرنے کے لیے شب و روز محنت سے کام کیا، حتیٰ کہ 1940ء میں مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس میں اس تصور کو اپنا سیاسی مطمح نظر بنادیا۔ قائدا عظم محمد علی جناح کی زیرِ قیادت مسلم لیگ نے سات سال کی مختصر مدت میں اس تصور کو حقیقت بنادیا، اور 14 اگست کو نظریہ ٔلا الہ الا اللہ کی بنیاد پر پاکستان کے نام سے دنیا کی سب سے

[1] PhD Scholar & Visiting Faculty Member Department of Islamic learning University of Karachi, Karachi
[2] PhD Scholar & Teaching Assistant Department of Islamic Learning University of Karachi, Karachi

پہلی اسلامی مملکت معرض وجود میں آگئی۔ تاہم 14 اگست 1947ء کو آزادی حاصل کرنے کے بعد نئی ریاست کے سامنے انتظامی، سماجی و سیاسی اور معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ ایک بڑا سوال یہ بھی تھا کہ پاکستان کا آئین کن بنیادوں پر استوار ہوگا اور ریاست کی نظریاتی سمت کیا ہوگی۔

قیام پاکستان کے بعد دستور ساز اسمبلی کے سامنے یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ایک ایسا آئین مرتب کرے جو عوامی نمائندگی، جمہوری اقدار اور اسلامی اصولوں کے درمیان متوازن تعلق قائم کرسکے۔ اس مقصد کے لیے مختلف سیاسی رہنماؤں، آئینی ماہرین، اسٹیک ہولڈرز اور علماء کی آراء سامنے آئیں۔ انہی مباحث کے دوران وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے 7 مارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد پیش کی، جو پانچ روزہ بحث کے بعد 12 مارچ 1949ء کو منظور ہوئی۔

اس قرارداد نے پہلی مرتبہ یہ واضح کیا کہ پاکستان کے آئینی نظام کی بنیاد اسلامی اصولوں پر استوار ہوگی جبکہ ریاست میں جمہوریت، عدل مساوات، مذہبی آزادی اور بنیادی حقوق کی بھی ضمانت دی جائے گی۔ قراردادِ مقاصد پاکستان کی آئینی تاریخ میں ایک بنیادی نظریاتی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے ریاست کے مقصدِ قانون سازی کے اصول حکومت اور رعایا کے باہمی تعلق کو ایک ایسے فکری دائرے میں متعین کیا جس میں اسلامی تعلیمات اور جدید آئینی تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے تمام آئینی مراحل میں اس قرارداد کو بنیادی رہنما اصول کے طور پر دیکھا گیا۔

دوسری جانب قراردادِ مقاصد کے بعد اسلامی دستور کی عملی شکل کے بارے میں مزید وضاحت کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اسی پس منظر میں 1951ء میں مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے اکتیس ممتاز علماء نے اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں پر اتفاق کرتے ہوئے بائیس متفقہ نکات مرتب کیے۔ یہ نکات قراردادِ مقاصد کے بعد سامنے آئے، اس لیے اُن نکات کو قراردادِ مقاصد کا سبب کہنا درست نہیں ہے، ان نکات کو اسلامی دستور سازی کے ارتقائی عمل کا اگلا مرحلہ قرار دینا تاریخی اعتبار سے زیادہ درست ہے۔ اس اتفاق رائے کی اہمیت اس لیے بھی نمایاں ہے کہ اس میں مختلف فقہی اور فکری مکاتب فکر سے وابستہ علماء نے بنیادی آئینی اصولوں پر مشترکہ موقف اختیار کیا، جو پاکستان کی اسلامی آئینی فکر میں ایک غیر معمولی پیش رفت تھی۔

زیر نظر تحقیق کا مقصد قراردادِ مقاصد اور علماء کے متفقہ تاریخی اتحاد (1951) کا الگ الگ تاریخی جائزہ لینے کے ساتھ یہ واضح کرنا ہے کہ ان دونوں دستاویزات نے پاکستان کی اسلامی دستور سازی پر کس حد تک اثر ڈالا، ان کے درمیان کون سے مشترک اُصول موجود تھے اور بعد کے آئینی ارتقا میں ان کی اہمیت کس صورت میں نمایاں ہوئی۔ اس تحقیق میں تاریخی تسلسل پارلیمانی مباحث آئینی دستاویزات اور معتبر علمی مراجع کی روشنی میں اس موضوع کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جائے گا اور آخر میں موجودہ دور کے آئینی استحکام کے تعلق سے بحث ہوگی، تاکہ پاکستان کی آئینی تاریخ کے اس اہم باب کو مستند اور متوازن انداز میں سمجھا جا سکے۔

قراردادِ مقاصد کا تاریخی پس منظر:

قیام پاکستان کے وقت نو قائم ریاست کے لیے کوئی مستقل دستور موجود نہیں تھا، لہٰذا عبوری طور پر Government of India Act, 1935 کو بعض ضروری ترامیم کے ساتھ نافذ رکھا گیا۔ اگرچہ یہ انتظام ریاستی اُمور چلانے کے لیے ناگزیر تھا، لیکن جلد ہی یہ احساس نمایاں ہونے لگا کہ

ایک نو آزاد مسلم ریاست کے لیے نو آبادیاتی دور کا قانون مستقل آئینی بنیاد نہیں بن سکتا۔[3] چنانچہ سیاسی قیادت، دینی حلقوں اور آئینی ماہرین کے درمیان اس امر پر بحث شروع ہوئی کہ پاکستان کا مستقل دستور کن اصولوں پر استوار ہونا چاہیے۔ اس سیاسی اور فکری پس منظر میں حکومت نے دستور ساز اسمبلی میں ایک ایسی قرارداد پیش کرنے کا فیصلہ کیا جو آئندہ دستور کے بنیادی اصول متعین کرے۔

قراردادِ مقاصد کی منظوری:

۷ مارچ 1949ء کو وزیرِ اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے قراردادِ مقاصد پیش کی، جس پر کئی روز تک تفصیلی پارلیمانی بحث ہوئی اور بالآخر 12 مارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی نے اسے منظور کر لیا[4]"

اس قرارداد میں یہ اصول تسلیم کیا گیا کہ حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے، جبکہ مملکت پاکستان اپنے اختیارات عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کے اندر ایک امانت کے طور پر استعمال کرے گی۔ ساتھ ہی جمہوریت، عدل، مساوات، مذہبی آزادی، اقلیتوں کے حقوق، بنیادی انسانی حقوق اور وفاقی نظام کو بھی مستقبل کے دستور کے بنیادی اصولوں میں شامل کیا گیا۔

اس اعتبار سے قراردادِ مقاصد پاکستان کی آئینی تاریخ میں ایک بنیادی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ اسی نے پہلی مرتبہ ریاست کی نظریاتی سمت اور آئینی فلسفے کو باقاعدہ دستوری شکل دی۔

دستور سازی کے عملی مراحل:

قراردادِ مقاصد کی منظوری کے فوری بعد دستور سازی کے عملی مراحل کا آغاز ہوا۔ اسی مقصد کے لیے بنیادی اصولوں کی کمیٹی (Basic Principles Committee) قائم کی گئی، جسے مستقبل کے دستور کے بنیادی خدوخال مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ کمیٹی نے اسلامی اصولوں کی تشریح اور آئینی رہنمائی کے لیے تعلیمات اسلامیہ بورڈ تشکیل دیا۔ جس کی سربراہی مولانا سید سلیمان ندوی نے کی جبکہ مولانا ظفر احمد انصاری اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس بورڈ میں ملک کے ممتاز علماء اور ماہرین شریعت شامل تھے، جنھوں نے اسلامی آئینی اصولوں کی تدوین میں بنیادی کردار ادا کیا[5]"

ایک اور کمیٹی بنائی گئی جس کے سپرد یہ کام ہوا کہ وہ اسمبلی میں پیش کرنے کے لیے دستور کا مسودہ مرتب کرے۔ دستور کا مسودہ تیار کرنے والی یہ کمیٹی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کہلائی۔ اس کا مرتب کردہ دستوری مسودہ 7 ستمبر 1950ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اپنی پہلی رپورٹ پیش کی جس میں قراردادِ مقاصد کو ریاستی پالیسی کے بنیادی رہنما اصول (Directive Principles of State Policy) کی حیثیت دینے کی سفارش کی گئی۔ اگرچہ اس رپورٹ پر متعدد حلقوں نے تنقید کی تاہم اس نے یہ اصول مستحکم کر دیا کہ مستقبل کا آئینی ڈھانچہ قراردادِ مقاصد سے رہنمائی حاصل کرے گا۔

---

[3] ڈاکٹر صفدر محمود، آئین پاکستان (لاہور: جنگ پبلشرز، 1991) ص 12

[4] Constituent Assembly of Pakistan, *Debates* (Karachi: Government of Pakistan Press, 1949) p. 94-98

[5] پروفیسر خورشید احمد، قراردادِ مقاصد: دستور سازی اور اعتراضات کا جائزہ، ماہنامہ عالمی ترجمان القرآن، اکتوبر 2015ء، ص 18

ابتدائی سفر میں قراردادِ مقاصد کی حیثیت محض ایک دیباچے کی تھی۔ یعنی جب 1956ء، 1962ء اور پھر 1973ء کے آئین مرتب ہوئے تو یہ قرارداد ان کے آغاز میں ایک تعارفی اور اصولی عبارت کے طور پر شامل کی گئی۔ قانونی زبان میں اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ اخلاقی رہنمائی تو فراہم کرتی ہے، لیکن کوئی شہری براہ راست اس کی بنیاد پر عدالت میں کسی قانون کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔

*1956*ء، 1962ء اور 1973ء کے دساتیر میں مختلف سیاسی حالات کے باوجود چند بنیادی اسلامی اصول مسلسل برقرار رہے[6]"

پھر سوال یہ ہے کہ یہ قانونی طور پر مؤثر کب ہوئی؟ اس کی تاریخ جنرل ضیاء الحق کے دور سے جڑتی ہے۔ 1985ء میں آٹھویں ترمیم کے ذریعے اس قرارداد کو صدارتی حکم نمبر 14 کی روسے آئین کے دفعہ،-2 الف کے طور پر شامل کر دیا گیا اور یوں اسے دستور کا باقاعدہ اور لازمی حصہ بنادیا گیا۔[7]

ان میں سب سے نمایاں اصول یہ تھا کہ ریاست کی قانون سازی قرآن و سنت سے ہم آہنگ ہو گی اور ایسے قوانین وضع نہیں کیے جائیں گے جو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہوں۔ اسی طرح موجودہ قوانین کو بھی تدریجاً اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی آئینی ذمہ داری تسلیم کی گئی۔ یہ امر اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ قراردادِ مقاصد ایک نظریاتی اعلامیہ کے ساتھ ہی ساتھ پاکستان کی آئینی روایت کی مستقل بنیاد بن چکی تھی۔ 1962ء کے دستور کی تیاری کے دوران بعض اسلامی دفعات میں تبدیلیاں کی گئیں، جن پر سیاسی اور مذہبی حلقوں نے شدید تحفظات کا اظہار کیا۔ بالخصوص قراردادِ مقاصد کی بعض بنیادی تعبیرات کو محدود کرنے کی کوشش کی گئی، تاہم بعد میں عوامی اور پارلیمانی دباؤ کے نتیجے میں متعدد اسلامی دفعات کو دوبارہ بحال کرنا پڑا۔ اسی عمل سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ قرارداد مقاصد کو عوامی تائید اور قومی قبولیت حاصل تھی جسے مستقل طور پر نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔

اس کے بعد سیاسی جماعتوں سے متعلق قانون سازی میں بھی "نظریۂ پاکستان" اور اسلامی تشخص کے مسئلے پر تفصیلی مباحث ہوئے۔ پارلیمانی مباحث کے نتیجے میں یہ مؤقف غالب آیا کہ پاکستان کی سیاسی اور آئینی شناخت کو اسلامی نظریے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس پیش رفت نے ایک مرتبہ پھر قراردادِ مقاصد کے بنیادی تصور کو تقویت دی اور واضح کیا کہ ریاست کی نظریاتی اساس اسلامی اصولوں ہی پر قائم رہے گی۔ دستور سازی کے مختلف مراحل سیاسی تبدیلیوں اور آئینی بحرانوں کے باوجود اس قرارداد کے بنیادی اصول مسلسل محفوظ رہے اور ہر نئے دستور میں کسی نہ کسی صورت اپنی جگہ بناتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی آئینی تاریخ میں قراردادِ مقاصد کو ایک ایسی بنیادی دستاویز تصور کیا جاتا ہے جس نے ریاست کے نظریاتی تشخص اور قانون سازی کی سمت اور اسلامی آئینی فکر کی بنیادوں کو مستقل طور پر متعین کیا۔

دستوری رپورٹ (1950) اور استرداد

قراردادِ مقاصد کی منظوری کے بعد پاکستان میں مستقل دستور کی تیاری کا مرحلہ شروع ہوا۔ حکومت نے اس مقصد کے لیے ایک طرف اسلامی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کرنے کی غرض سے اہل دانش و بینش اور قرآن و سنت کے ماہرین پر مشتمل ایک مشاورتی بورڈ قائم کیا، جبکہ دوسری جانب بنیادی اصولوں کی کمیٹی (Basic Principles Committee) کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ملک کے مستقل دستور کا ابتدائی مسودہ

---

[6] ایضا، ص 18

[7] عبدالرحمن مدنی، حافظ، محدث، شمارہ) 337 لاہور: مجلس التحقیق الاسلامی 99 جے ماڈل ٹاؤن (ص 2

تیار کرے۔ اس کمیٹی سے توقع کی جارہی تھی کہ وہ قراردادِ مقاصد میں بیان کردہ اسلامی اصولوں کو دستور کی عملی دفعات میں مناسب انداز سے شامل کرے گی۔

ستمبر 1950ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے اپنی پہلی رپورٹ شائع کی لیکن اس رپورٹ کو منظر عام پر آتے ہی شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ ناقدین کا مؤقف تھا کہ اگرچہ قراردادِ مقاصد میں اسلامی تشخص کو آئینی بنیاد قرار دیا گیا تھا، مگر مجوزہ دستوری خاکہ اس کی حقیقی روح کی مکمل ترجمانی نہیں کرتا۔ متعدد علماء (مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا محمد اسماعیل وغیرہ) اور آئینی ماہرین کی رائے میں رپورٹ میں اسلامی تعلیمات کے عملی نفاذ سے متعلق سفارشات کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی توقع کی جارہی تھی۔ اسی تناظر میں اسلامی تعلیمات کے بورڈ سے وابستہ علماء نے ایک مشترکہ وضاحتی بیان 13 اکتوبر 1950ء کو جاری کیا، جس میں واضح کیا گیا کہ بورڈ نے اپنی سفارشات قرآن و سنت کی روشنی میں مرتب کی تھیں تاہم ان سفارشات کو قبول یا رد کرنے کا اختیار بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے پاس تھا۔ اس لیے اگر عوام یا دینی حلقوں کو مجوزہ رپورٹ پر اعتراضات ہیں تو ان کا تعلق کمیٹی کے حتمی مسودے سے ہے نہ کہ بورڈ کی سفارشات سے۔ اس بیان میں اس عزم کا بھی اعادہ کیا گیا کہ پاکستان کا مستقل دستور قراردادِ مقاصد کے تقاضوں اور اسلامی اصولوں کے مطابق مرتب ہونا چاہیے۔[8]

اس رپورٹ پر سب سے نمایاں علمی تنقید مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کی۔ انہوں نے مختلف اجتماعات اور تحریروں میں یہ مؤقف اختیار کیا کہ مجوزہ دستوری خاکہ اسلامی ریاست کی ذمہ داریوں کو مطلوبہ وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کرتا۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ ریاست کی ذمے داری صرف دینی تعلیم کی فراہمی تک محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ اسے معاشرے میں معروف کے قیام، منکرات کے انسداد اور اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے بھی مؤثر کردار ادا کرنا چاہیے۔[9]

ملک گیر تنقید اور عوامی ردِّ عمل کے باعث حکومت کو اس ابتدائی رپورٹ پر نظرِ ثانی کرنا پڑی۔ اس صورت حال نے ایک اور اہم سوال کو جنم دیا کہ جب مختلف فقہی مکاتب فکر موجود ہیں تو کیا اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں پر اتفاق رائے ممکن ہے، اس اعتراض کے جواب میں مختلف دینی مکاتب فکر کے اکابر علماء نے باہمی مشاورت کا راستہ اختیار کیا۔

اکتیس علماء کے 22 متفقہ دستوری نکات

21، 22، 23 اور 24 جنوری 1951ء میں کراچی میں منعقد ہونے والے تاریخی اجتماع کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں برصغیر کے مختلف فقہی مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے ممتاز علماء نے شرکت کی۔ یہ اجتماع کسی ایک مذہبی جماعت یا فقہی مکتب فکر کی نمائندگی نہیں کرتا تھا، بلکہ اس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ مکاتب فکر کے جید علماء نے اپنے جزوی اختلافات کو ایک طرف رکھتے ہوئے مشترکہ طور پر اسلامی دستور کے بنیادی اصولوں پر اتفاق رائے قائم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ 22 متفقہ نکات کو پاکستان کی آئینی تاریخ میں بین المسالک ہم آہنگی کی ایک غیر معمولی مثال قرار دیا جاتا ہے۔

1) حاکمیت اعلیٰ:

---

[8] روزنامہ جنگ، 14 اکتوبر 1950ء

[9] حفیظ الرحمن صدیقی، قرارداد مقاصد سے اسلامی قانون تک، ص 215

AL-AASAR Journal
Vol. 3, No. 1 (2026)
Quarterly Research Journal
Online ISSN: 3006-693X
www. al-aasar.com
Print ISSN: 3006-6921

ریاست میں حقیقی اور اعلیٰ ترین حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہو گی۔ ریاستی نظام اور قانون سازی اسی بنیادی تصور کے تابع ہوں گے۔

2) **قرآن وسنت کی بالادستی:**

ریاست کا قانونی نظام قرآن و سنت کے اصولوں پر قائم ہو گا۔ ایسا کوئی قانون یا انتظامی حکم نافذ نہیں کیا جائے گا جو قرآن و سنت کے منافی ہو۔ سابقہ ایسے قوانین جو اسلامی اصولوں سے متصادم ہوں انہیں بتدریج مقررہ مدت کے اندر ختم یا شریعت کے مطابق تبدیل کرنے کی گنجائش رکھی جائے گی۔

3) **ریاست کی نظریاتی اساس:**

مملکت کی بنیاد محض جغرافیہ نسل زبان یا کسی علاقائی شناخت پر نہیں ہو گی، بلکہ اس کی بنیادی نظریاتی اساس اسلام کے پیش کردہ نظام حیات پر قائم ہو گی۔

4) **اسلامی معاشرے کے قیام کی ذمہ داری:**

ریاست کی ذمہ داری ہو گی کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق نیکی اور معروف اقدار کے فروغ اور برائی و منکرات کی روک تھام کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔ اسلامی شعائر کے تحفظ اور مختلف مسلم مکاتب فکر کے پیروکاروں کے لیے ان کے مذہبی تقاضوں کے مطابق دینی تعلیم کا انتظام بھی ریاستی ذمہ داری میں شامل ہو گا۔

5) **اسلامی اخوت اور قومی وحدت:**

ریاست مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اخوت کو مضبوط بنانے کی کوشش کرے گی اور نسلی، لسانی، علاقائی اور دیگر تعصبات کو قومی وحدت کے لیے رکاوٹ بننے سے روکے گی، تاکہ ملت اسلامیہ کے اتحاد کو فروغ حاصل ہو۔

6) **بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی:**

ریاست ان تمام شہریوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ دار ہو گی جو مستقل یا عارضی طور پر روزگار کمانے کی صلاحیت سے محروم ہوں۔ اس میں خوراک لباس، رہائش، علاج اور تعلیم جیسی بنیادی ضروریات شامل ہوں گی اور اس ذمہ داری میں مذہب یا نسل کی بنیاد پر امتیاز نہیں کیا جائے گا۔

7) **شہری حقوق کا تحفظ:**

ریاست کے شہریوں کو شریعت کے مقرر کردہ دائرے میں جان، مال، عزت، مذہب، عبادت، شخصی آزادی، اظہار رائے، نقل و حرکت، اجتماع اور روزگار سمیت بنیادی حقوق حاصل ہوں گے۔ ترقی کے مواقع اور فلاحی اداروں سے مستفید ہونے کے حق کو بھی تسلیم کیا جائے گا۔

8) **قانونی تحفظ اور منصفانہ عدالتی عمل:**

کسی شہری کے بنیادی حقوق کو اسلامی قانون کی جائز بنیاد کے بغیر سلب نہیں کیا جا سکے گا۔ اسی طرح کسی شخص کو جرم کے الزام میں مناسب عدالتی کارروائی، صفائی کا موقع دیا جائے گا اور عدالت کے فیصلے کے بغیر سزا نہیں دی جائے گی۔

9) مسلم مکاتبِ فکر کی مذہبی آزادی:

ریاست کے مسلم مکاتبِ فکر کو قانون کی حدود میں مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروکاروں کو مذہبی تعلیم دینے اپنے مذہبی افکار کی اشاعت کرنے اور اپنے فقہی اصولوں کے مطابق شخصی معاملات حل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ اس مقصد کے لیے متعلقہ فقہی مکتب کے قاضیوں کے ذریعے معاملات کے فیصلے کا انتظام بھی کیا جا سکے گا۔

10) غیر مسلم شہریوں کی مذہبی آزادی:

غیر مسلم شہریوں کو بھی قانون کے دائرے میں اپنے مذہب، عبادات، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم پر عمل کرنے کی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے شخصی معاملات اپنے مذہبی قوانین یا تسلیم شدہ رسوم و رواج کے مطابق حل کرانے کا حق دیا جائے گا۔

11) غیر مسلم شہریوں کے حقوق کا تحفظ:

ریاست غیر مسلم شہریوں کے ساتھ کیے گئے جائز معاہدات کی پابندی کرے گی۔ شہری حقوق کے بنیادی دائرے میں مسلم اور غیر مسلم باشندوں کے ساتھ بلاجواز امتیاز نہیں کیا جائے گا۔

12) ریاستی سربراہ کی اہلیت:

ریاست کا سربراہ مسلمان مرد ہوگا اور اس کے انتخاب میں اس کی دینی وابستگی، صلاحیت اور درست فہم و رائے کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگی۔ اس کے کردار اور اہلیت پر عوام اور ان کے منتخب نمائندوں کا اعتماد ضروری ہوگا۔

13) ریاستی نظم کی ذمہ داری:

ریاست کے انتظام و انصرام کی بنیادی ذمہ داری ریاستی سربراہ پر ہوگی۔ تاہم وہ اپنے اختیارات کا مناسب حصہ کسی فرد یا ادارے کو تفویض کر سکتا ہوگا۔

14) شورائیت اور مشاورت:

ریاستی نظام شخصی یا آمرانہ طرزِ حکومت پر قائم نہیں ہوگا بلکہ شورائیت کے اصول کے مطابق چلایا جائے گا۔ ریاستی سربراہ حکومتی ذمہ داران اور عوام کے منتخب نمائندوں سے مشاورت کے ذریعے اپنے فرائض انجام دے گا۔

15) دستور کی بالادستی:

ریاستی سربراہ کو یہ اختیار حاصل نہیں ہوگا کہ وہ مکمل یا جزوی طور پر دستور کو معطل کر کے شوریٰ اور آئینی نظام سے ہٹ کر حکومت کرے۔ ریاستی اختیارات آئینی حدود کے پابند ہوں گے۔

16) ریاستی سربراہ کی معزولی:

جس نمائندہ ادارے یا جماعت کو ریاستی سربراہ منتخب کرنے کا اختیار حاصل ہوگا، اسے اکثریتی رائے کے ذریعے سربراہ مملکت کو عہدے سے ہٹانے کا اختیار بھی حاصل ہوگا۔

17) سربراہِ مملکت کا قانونی احتساب:

AL-AASAR Journal Vol. 3, No. 1 (2026)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www. al-aasar.com Print ISSN: 3006-6921

ریاستی سربراہ شہری حقوق کے اعتبار سے عام شہریوں سے بالاتر نہیں ہوگا اور اسے قانون کے سامنے جواب دہ ہونا ہوگا۔ اسے قانونی احتساب سے کوئی مطلق استثنیٰ حاصل نہیں ہوگا۔

18) قانون کی مساوی عملداری:

ریاستی حکام، سرکاری اہلکاروں اور عام شہریوں کے لیے قانون کی بنیادی عملداری یکساں ہوگی۔ حکومتی عہدہ کسی شخص کو قانون سے بالاتر نہیں بنائے گا اور عدالتی نظام سب کے لیے یکساں ہوگا۔

19) عدلیہ کی آزادی:

عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ اور آزاد حیثیت حاصل ہوگی تاکہ جج صاحبان حکومتی دباؤ یا انتظامی مداخلت سے آزاد ہو کر انصاف کے تقاضے پورے کر سکیں۔

20) ریاست کے بنیادی اصولوں کا تحفظ:

ایسے افکار و نظریات کی منظم ترویج کی اجازت نہیں ہوگی جو ریاست کے بنیادی اسلامی اصولوں اور اس کی نظریاتی اساس کو ختم کرنے کا باعث بنیں۔

21) ریاستی وحدت اور انتظامی اکائیاں:

ریاست کے مختلف صوبے اور علاقے ایک ہی مملکت کی انتظامی اکائیاں تصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت مستقل نسلی، لسانی یا قبائلی ریاستوں کی نہیں ہوگی۔ انتظامی ضرورت کے تحت مرکز کی نگرانی میں انہیں اختیارات دیے جاسکتے ہیں، تاہم ریاست سے علیحدگی کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

22) دستور کی شرعی تعبیر:

دستور کی ایسی تشریح قابل قبول نہیں ہوگی جو قرآن و سنت کے اصولوں سے متصادم ہو۔ آئینی تشریح میں اسلامی اصولوں کو بنیادی رہنما حیثیت حاصل ہوگی[10]

ان تمام نکات کا مجموعی مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ 1951ء میں مرتب ہونے والے یہ اصول اسلامی دستور سازی کی ایک جامع فکری دستاویز تھے۔ اگرچہ یہ سرکاری آئین کا حصہ نہیں بنے تاہم بعد کے آئینی مباحث خصوصاً 1956ء کے دستور کی تیاری میں ان سے نمایاں استفادہ کیا گیا۔ اس لحاظ سے 22 متفقہ نکات کو قراردادِ مقاصد کے بعد اسلامی آئینی فکر کی سب سے منظم اور متفقہ علمی کاوش قرار دیا جاسکتا ہے۔

اکتیس علمائے کرام کے اسمائے گرامی:

مجلس میں شریک نمایاں علماء کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

[10] ابوعمار زاہد الراشدی، دستوری سفارشات پر مشاہیر علماء کا تبصرہ اور ترمیمات، ماہنامہ الشریعہ، جلد 26، شمارہ) 7 گوجرانوالہ: جولائی 2015ء(ص 6-4

- علامہ سلیمان ندوی (صدر مجلس)
- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (امیر جماعت اسلامی پاکستان)
- مولانا شمس الحق افغانی (وزیر معارف، ریاست قلات)
- مولانا محمد بدر عالم (استاذ حدیث، دارالعلوم الاسلامیہ اشرف آباد، سندھ)
- مولانا احتشام الحق تھانوی (مہتمم، دارالعلوم الاسلامیہ اشرف آباد، سندھ)
- مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی (صدر، جمعیت علمائے پاکستان، سندھ)
- مفتی محمد شفیع (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان)
- مولانا محمد ادریس (شیخ الجامعہ، جامعہ عباسیہ بہاولپور)
- مولانا خیر محمد (مہتمم، خیر المدارس، ملتان)
- مفتی محمد حسن (مہتمم، جامعہ اشرفیہ، لاہور)
- پیر محمد امین الحسنات (مانکی شریف، سرحد)
- مولانا محمد یوسف بنوری (شیخ التفسیر، دارالعلوم الاسلامیہ اشرف آباد، سندھ)
- حاجی خادم الاسلام محمد امین (المجاہد آباد، پشاور)
- قاضی عبدالصمد سربازی (قاضی قلات، بلوچستان)
- مولانا اطہر علی (صدر عامل، جمعیت علمائے اسلام، مشرقی پاکستان)
- مولانا ابوجعفر محمد صالح (امیر، جمعیت حزب اللہ، مشرقی پاکستان)
- مولانا راغب احسن (نائب صدر، جمعیت علمائے اسلام، مشرقی پاکستان)
- مولانا محمد حبیب الرحمن (نائب صدر، جمعیت المدرسین، مشرقی پاکستان)
- مولانا محمد علی جالندھری (مجلس احرار اسلام پاکستان)
- مولانا داؤد غزنوی (صدر، جمعیت اہل حدیث پاکستان)
- مفتی جعفر حسین مجتہد) رکن، بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان(
- مفتی حافظ کفایت حسین مجتہد) ادارۂ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان، لاہور(
- مولانا محمد اسماعیل) ناظم، جمعیت اہل حدیث پاکستان، گوجرانوالہ(
- مولانا حبیب اللہ) جامعہ دینیہ دارالہدیٰ، خیر پور میرس(
- مولانا احمد علی) امیر، انجمن خدام الدین، لاہور(
- مولانا محمد صادق) مہتمم، مدرسہ مظہر العلوم، کراچی(
- پروفیسر عبدالخالق) رکن، بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان(

AL-AASAR Journal Vol. 3, No. 1 (2026)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www. al-aasar.com Print ISSN: 3006-6921

- مولانا شمس الحق فرید پوری) صدر و مہتمم، مدرسہ اشرف العلوم، ڈھاکہ(
- مفتی محمد صاحب داد)سندھ مدرسۃ الاسلام، کراچی(
- مولانا محمد ظفر احمد انصاری) سیکرٹری، بورڈ آف تعلیمات اسلام، مجلس دستور ساز پاکستان(
- پیر محمد ہاشم مجددی) ٹنڈو سائیں داد، سندھ[11]

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ان علماء نے فقہی اختلافات کو دستوری اختلافات میں تبدیل کرنے کے بجائے ان اصولوں پر اتفاق کیا جنھیں تمام مکاتب فکر اسلامی ریاست کی مشترکہ بنیاد تصور کرتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ 22 نکات کو صرف ایک مذہبی اعلامیہ نہیں بلکہ اسلامی آئینی فکر کی مشترکہ دستاویز کی حیثیت حاصل ہوئی۔اس اجتماع نے یہ تاثر بھی ختم کیا کہ مختلف فقہی مکاتب فکر کسی مشترکہ دستوری تصور پر متفق نہیں ہو سکتے، بلکہ اس نے عملاً ثابت کیا کہ مشترکہ دینی اصولوں کی بنیاد پر قومی آئین کی تشکیل ممکن ہے۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ(1952)

1959ء میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ پر شدید عوامی اور علمی تنقید کے بعد حکومت کو دستور سازی کے عمل پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ تقریباً دو برس تک اس سلسلے میں کوئی نمایاں پیش رفت نہ ہوئی، تاہم اس دوران مختلف دینی اور سیاسی حلقوں نے اسلامی دستور کی تیاری کے مطالبے کو مسلسل زندہ رکھا۔خصوصاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے عوامی اجتماعات اخباری بیانات اور علمی مباحث کے ذریعے حکومت پر زور دیا کہ قراردادِ مقاصد کی روح کے مطابق جلد از جلد مستقل دستور مرتب کیا جائے۔

> "1952 میں حکومت نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کو از سر نو فعال کیا اور نظر ثانی شدہ دستوری رپورٹ تیار کرنے کا عمل شروع ہوا۔اس دوران مختلف مذہبی جماعتوں آئینی ماہرین اور علماء نے اپنی تجاویز حکومت کو پیش کیں۔ان آراء میں سب سے زیادہ اثر ان اصولوں کا تھا جو 1951ء میں اکتیس علماء نے متفقہ طور پر مرتب کیے تھے۔چنانچہ نئی رپورٹ میں پہلی رپورٹ کے مقابلے میں اسلامی دفعات کو زیادہ نمایاں حیثیت دی گئی[12]"

22 دسمبر 1952ء کو شائع ہونے والی رپورٹ میں یہ اصول شامل کیے گئے کہ مستقبل کا دستور قرآن و سنت سے ہم آہنگ ہو گا، اسلامی قوانین سے متعلق رہنمائی کے لیے علماء پر مشتمل ایک مشاورتی ادارہ قائم کیا جائے گا، ریاست شہریوں کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ذمہ داری قبول کرے گی، صدر مملکت مسلمان ہو گا، عدلیہ کو انتظامیہ سے الگ رکھا جائے گا اور مسلمانوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں گے۔ان نکات سے واضح ہوتا ہے کہ حکومت نے پہلی رپورٹ پر ہونے والی تنقید کو کسی حد تک پیش نظر رکھا تھا۔[13] اگرچہ علماء نے اس

---

[11] ابو عمار زاہد الراشدی، پاکستان میں نفاذ شریعت کی متفقہ دستاویزات، *ماہنامہ ایوان اسلام*) کراچی 11 اکتوبر 2011ء(ص 4
[12] حفیظ الرحمن صدیقی، قرارداد مقاصد سے اسلامی قانون تک، ص 221
[13] ڈاکٹر صفدر محمود، آئین پاکستان)لاہور: جنگ پبلشرز، 1991(ص 16-15

رپورٹ کو 1950ء کے مسودے کے مقابلے میں ایک مثبت پیش رفت قرار دیا تاہم انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ بعض بنیادی امور میں مزید اصلاح کی ضرورت باقی ہے۔

> "اسی مقصد کے لیے 11 جنوری 1953ء میں دوبارہ علماء کا اجلاس منعقد ہوا18 جنوری تک، جس میں رپورٹ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور متعدد اصلاحی تجاویز مرتب کر کے حکومت کے سامنے پیش کی گئیں"[14]

ان سفارشات کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ قراردادِ مقاصد اور 22 متفقہ دستوری نکات کو آئین کا مؤثر حصہ بنایا جائے تاکہ اسلامی ریاست کا تصور صرف نظریاتی اعلان تک محدود نہ رہے بلکہ عملی دستوری صورت بھی اختیار کرے۔

مارشل لاء اور دستور سازی کا تعطل

23 مارچ 1956ء کو نافذ ہونے والا پاکستان کا پہلا دستور ملک کی طویل آئینی جدوجہد کا نتیجہ تھا لیکن یہ دستور زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکا۔ 7 اکتوبر 1958ء کو صدر اسکندر مرزا نے دستور منسوخ کر کے مرکزی و صوبائی اسمبلیاں تحلیل کر دیں اور ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اسی روز جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا، جبکہ چند ہی ہفتوں بعد اقتدار مکمل طور پر ایوب خان کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا۔

> "1956ء کے دستور کی تنسیخ سیاسی تبدیلی کے ساتھ پاکستان کے آئینی ارتقا میں ایک اہم تعطل بھی ثابت ہوئی۔ اس اقدام سے وہ آئینی پیش رفت رک گئی جو قراردادِ مقاصد 1949ء سے شروع ہو کر 1951ء کے 22 نکات اور پھر 1956ء کے اسلامی دستور تک پہنچی تھی۔ متعدد آئینی ماہرین نے اس مرحلے کو پاکستان میں جمہوری تسلسل کے ٹوٹنے اور دستور کی بالادستی کو نقصان پہنچنے کا آغاز قرار دیا۔ اس حقیقت کی طرف جسٹس اے۔ آر۔ کارنیلیس نے بھی توجہ دلائی کہ ریاست کی پائیداری کا انحصار آئینی تسلسل پر ہوتا ہے نہ کہ محض انتظامی اختیارات پر[15] "

اسی لیے 1958ء کے بعد دستور سازی کا پورا عمل ایک نئی سمت اختیار کر گیا۔ یہ صورت حال اس امر کی غماز تھی کہ اگرچہ قراردادِ مقاصد بطور نظریاتی بنیاد موجود تھی، لیکن سیاسی عدم استحکام نے اس کی عملی تعبیر کو مسلسل متاثر کیا۔

1962ء کا دستور

مارشل لاء کے بعد صدر ایوب خان نے نئی آئینی تشکیل کے لیے ایک آئینی کمیشن قائم کیا، جس کی سربراہی سابق چیف جسٹس محمد شہاب الدین نے کی۔ کمیشن نے مختلف سیاسی جماعتوں آئینی ماہرین اور دینی حلقوں سے تجاویز طلب کیں۔ مذہبی قیادت نے بھی قراردادِ مقاصد اور 22 نکات کی روشنی میں اسلامی دستور کی سفارشات پیش کیں، تاہم ان میں سے متعدد تجاویز کو حتمی آئین میں شامل نہیں کیا گیا۔

---

[14] حفیظ الرحمن صدیقی، قرارداد مقاصد سے اسلامی قانون تک، ص221

[15] Hamid Khan, *Constitutional and Political History of Pakistan*, 3rd ed (Karachi: Oxford University Press, 2017)p122-125.

AL-AASAR Journal Vol. 3, No. 1 (2026)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www. al-aasar.com Print ISSN: 3006-6921

یکم مارچ 1962ء کو نیا دستور نافذ کیا گیا۔ اس دستور میں اگرچہ قراردادِ مقاصد کے بنیادی نظریے سے مکمل انحراف نہیں کیا گیا تاہم 1956ء کے دستور میں موجود کئی اسلامی دفعات کو محدود کر دیا گیا۔ قرآن و سنت سے متصادم قانون سازی نہ کرنے کا اصول برقرار رکھا گیا، لیکن اسلامی ریاست کے مثبت فرائض، اسلامی معاشرت کی تشکیل اور ریاستی ذمے داریوں سے متعلق متعدد دفعات کو نسبتاً کمزور صورت میں پیش کیا گیا۔[16]
اس بنا پر مذہبی و آئینی حلقوں نے 1962ء کے دستور پر یہ تنقید کی کہ اس میں اسلامی شناخت کو برقرار تو رکھا گیا لیکن اس کی عملی جہت کو محدود کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بعد کے برسوں میں آئینی اصلاحات اور اسلامی دفعات کی بحالی کا مطالبہ دوبارہ شدت اختیار کر گیا۔ آخر کار جنرل ضیاء الحق کے دور میں 1985ء میں آٹھویں ترمیم کے ذریعے اس قرارداد کو صدارتی حکم نمبر 14 کی روسے آئین کے دفعہ ،-2 الف کے طور پر شامل کر دیا گیا اور یوں اسے دستور کا باقاعدہ اور لازمی حصہ بنا دیا گیا۔ لیکن اب پھر ضرورت ہے کہ آئینی استحکام میں اصلاحات ہو سکے۔

عصرِ حاضر میں آئین کا استحکام

معاصر دور میں کسی بھی ریاست کی سیاسی پائیداری ادارہ جاتی مضبوطی اور قومی ترقی کا دارومدار ایک مستحکم آئینی نظام پر ہوتا ہے۔ جب آئین کی بالادستی کو عملی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے، قانون کی حکمرانی کو یقینی بنایا جاتا ہے اور تمام ادارے اپنی آئینی حدود میں رہ کر فرائض انجام دیتے ہیں تو ریاست میں استحکام انصاف اور ترقی کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔
بدقسمتی سے پاکستان میں مختلف ادوار میں آئین کی حقیقی روح کے مطابق عمل درآمد میں کمزوریاں، قانون کی غیر مساوی عملداری، ادارہ جاتی کشیدگی، سیاسی مفادات کی بالادستی اور آئینی تقاضوں سے انحراف جیسے عوامل سامنے آتے رہے ہیں۔ مزید یہ کہ قیام پاکستان کے بعد دستور میں متعدد آئینی ترامیم کی جاچکی ہیں اور اب تک 26 آئینی ترامیم نافذ ہو چکی ہیں، جو اس امر کی نشاندہی کرتی ہیں کہ آئین وقت کے تقاضوں کے مطابق ارتقاء پذیر رہا ہے۔ تاہم آئینی اصلاحات کے باوجود اگر قانون کی مؤثر اور مساوی عملداری یقینی نہ بنائی جائے تو محض آئینی ترامیم سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کو مختلف اوقات میں سیاسی بے یقینی، ادارہ جاتی کشیدگی، امن و امان کے مسائل، معاشی مشکلات اور سماجی انتشار جیسے چیلنجز کا سامنا رہا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کسی بھی ملک کی پائیدار ترقی کا انحصار صرف آئین کی موجودگی یا اس میں ترامیم پر نہیں بلکہ اس کے مؤثر غیر جانبدار اور یکساں نفاذ پر ہوتا ہے، جو کہ یہاں اس کی کمی ہے۔

اسی تناظر میں قرارداد مقاصد اور 31 جید علماء کے متفقہ 22 دستوری نکات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ نکات پاکستان کے آئینی اور نظریاتی خدوخال کے تعین کے لیے ایک مشترکہ قومی و دینی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں، جن پر تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء نے اتفاق کیا تھا۔ اگر آج بھی ان نکات کے بنیادی اصولوں، مثلاً آئین کی بالادستی، قانون کی حکمرانی، عدل و انصاف) میرٹ (عوامی حقوق کے تحفظ) چوری ڈکیتی (ریاستی ذمہ داریوں اور اسلامی اقدار کو ان کی اصل روح کے مطابق نافذ کیا جائے) سود کا خاتمہ (تو یہ نہ صرف آئینی استحکام کو مزید مضبوط بنانے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں بلکہ قومی یکجہتی ادارہ جاتی ہم آہنگی عوامی اعتماد سیاسی استحکام امن و امان معاشی خوشحالی اور سماجی ترقی کے لیے بھی ایک

[16] Hamid Khan, *Constitutional and Political History of Pakistan*, 3rd ed (Karachi: Oxford University Press, 2017) p143-156.

AL-AASAR Journal Vol. 3, No. 1 (2026)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www. al-aasar.com Print ISSN: 3006-6921

مضبوط بنیاد فراہم کر سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے 31 علماء کے 22 متفقہ دستوری نکات صرف ایک تاریخی دستاویز نہیں بلکہ عصر حاضر میں بھی پاکستان کے آئینی ارتقاء اور قومی ترقی کے لیے ایک مؤثر فکری و عملی رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ریاست پاکستان کا استحکام

ریاست کے استحکام کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کے جغرافیائی وجود مضبوط ہو، ریاستی ادارے اور انتظامی قوت مستحکم ہو، لیکن اس کے ساتھ کسی بھی ریاست کے پائیدار استحکام کے لیے سیاسی استحکام، معاشرتی ہم آہنگی، معاشی پائیداری، قانون مساوات، عمل داری، شہری حقوق کا تحفظ اور عوام کا ریاستی اداروں پر اعتماد بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ جب ریاست میں قانون سب کے لیے یکساں ہو شہریوں کو انصاف اور مساوی مواقع حاصل ہوں ریاستی ادارے اپنی آئینی حدود میں رہتے ہوئے فرائض انجام دیں اور حکمرانی، عوامی اعتماد کے اصول پر قائم ہو تو ریاست کے اندر پائیدار استحکام پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سیاسی عدم استحکام، ادارہ جاتی تصادم، قانون کی کمزور عمل داری، معاشی واقتصادی بحران وبے یقینی اور معاشرتی تقسیم ریاستی نظم کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اس لیے ریاستی استحکام کو صرف انتظامی طاقت کے بجائے قانون، عدل، ذمے دار حکمرانی اور اجتماعی اعتماد کے مجموعے کے طور پر دیکھنا زیادہ مناسب ہے۔

اسلامی تصورِ ریاست میں بھی ریاست کا مقصد صرف اقتدار کا حصول یا حکومتی ڈھانچے کو برقرار رکھنا نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسے اجتماعی نظام کا قیام ہے جس میں عدل، قانون، حقوق اور اجتماعی مصالح کا تحفظ ہو۔ ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کے نزدیک اسلامی ریاست کے تصور کو سمجھنے کے لیے یہ بنیادی نکتہ سامنے رکھنا ضروری ہے کہ اسلام میں شریعت اور ریاست باہم مربوط ہیں۔ ان کے نزدیک دین اور حکومت ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون اور تکمیلی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ماوردیؒ کے حوالے سے واضح کرتے ہیں کہ جب دین کمزور ہوتا ہے تو حکومت بھی کمزوری کا شکار ہوتی ہے اور جب دین کی پشت پناہی کرنے والی حکومت ختم ہو جائے تو دینی شعائر اور اسلامی اقدار بھی متاثر ہونے لگتی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں ریاستی نظم اور دینی اصولوں کے درمیان تعلق عملی اور باہمی نوعیت کا ہے۔[17]

اسی تصور کو مزید واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ اسلامی ریاست اور عام ریاست کے بنیادی فرق کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ ان کے مطابق عام سیاسی تصور میں ریاست کو بنیادی مقصد اور قانون کو ریاست کے نظم ونسق کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، جبکہ اسلامی تصور میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام میں شریعت بنیادی رہنما اصول ہے اور ریاست اس کے نفاذ، تحفظ اور اجتماعی زندگی کی تنظیم کا ذریعہ بنتی ہے۔ چنانچہ اسلامی نقطۂ نظر سے ریاست بذاتِ خود آخری مقصد نہیں بلکہ عدل، شریعت اور اجتماعی خیر کے حصول کا ایک اہم وسیلہ ہے۔ اس تصور سے ریاستی اقتدار کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے کہ حکمران اور ادارے قانون سے بالاتر نہیں بلکہ ایک اعلیٰ قانونی و اخلاقی نظام کے پابند ہیں۔[18]

اس اصول کی روشنی میں ریاست کے استحکام کا جائزہ صرف اس بنیاد پر نہیں لیا جاسکتا کہ اقتدار کس شخص یا جماعت کے پاس ہے، بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ریاست اپنے بنیادی اصولوں اور ذمہ داریوں کو کس حد تک پورا کر رہی ہے۔ اسلامی سیاسی فکر میں حکمران کے اقتدار میں آنے کے

---

[17] محمود احمد غازی، محاضرات شریعت، ص 287

[18] محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص 333

AL-AASAR Journal Vol. 3, No. 1 (2026)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www. al-aasar.com Print ISSN: 3006-6921

طریقے کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اس کے بعد ریاست کے عملی کردار، شریعت کی بالادستی، عدل وانصاف، شہریوں کے تحفظ اور اجتماعی نظم کو بھی بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ نے فقہی مباحث کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ اگر کسی حکمران کا اقتدار مثالی طریقے سے قائم نہ بھی ہوا ہو لیکن وہ شریعت کی بالادستی کو تسلیم کرتا ہو، ریاست میں عدل قائم کرتا ہو، شہریوں کی جان ومال اور عزت کی حفاظت کرتا ہو، عدالتوں کو آزادانہ کام کرنے دیتا ہو اور ریاست کی بنیادی، دینی واجتماعی ذمے داریاں ادا کرتا ہو تو فقہی روایت میں اس کی حکمرانی کے عملی کردار کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔[19]

ریاست میں بگاڑ کی تین صورتیں

اس بحث سے ریاستی بگاڑ کے مختلف درجات کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔

1) اقتدار کو بزورِ طاقت اپنے ہاتھ میں لے لینا اور اسلامی ریاست میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہ ہونا، جزوی بگاڑ ہے۔

2) نااہل حکمران کا قابل اعتراض راستے سے اقتدار میں آجانا؛ لیکن بعد از اقتدار، ریاست کے بنیادی اسلامی کردار، اساسی اصولوں یا شریعت کے عمومی مزاج کو مجروح نہ کرنا اور اساسی اسلامی معاشرتی ڈھانچے کو برقرار رکھنا۔

3) سیاسی اور ریاستی معاملات میں شریعت کے عمومی کردار کا انکار، ریاست کے اسلامی کردار کو تسلیم نہ کیا جانا، اسلامی قوانین کی بنیادوں ہی کے ڈھانے کا عمل شروع کر دینا۔

دورِ جدید کی " مسلم ریاستوں " اور حکومتوں میں بگاڑ کی مختلف شکلیں اور درجات ہیں : کہیں بگاڑ ابھی ابتدائی سطح کا ہے؛ کہیں اس کا پھیلاؤ اور عمق رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا ہے اور کہیں تو ایسا لگتا ہے کہ بگاڑ اپنی آخری شکل میں ظاہر ہو چکا ہے۔ تاہم بگاڑ کی زیادہ سنگین صورت اس وقت سامنے آتی ہے جب ریاستی اور سیاسی معاملات میں اسلامی اصولوں کے کردار ہی سے انکار شروع ہو جائے اور ریاست کے بنیادی اسلامی تشخص اور شریعت کی قانونی واخلاقی رہنمائی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے ریاستی استحکام کا حقیقی معیار صرف اقتدار کا تسلسل نہیں بلکہ ریاست کے بنیادی اصولوں قانون عدل اور اجتماعی ذمہ داریوں کی حفاظت بھی ہے۔

پاکستان کے تناظر میں یہ بحث مزید اہم ہو جاتی ہے کیونکہ قیام پاکستان کے پس منظر میں جغرافیائی اور انتظامی مطالبے کے ساتھ ایک مخصوص نظریاتی تصور کا مطالبہ بھی کارفرما تھا۔ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ تحریک پاکستان کو برصغیر کے مسلمانوں کی ایسی اجتماعی جدوجہد قرار دیتے ہیں جس میں مسلمانوں نے اپنی جداگانہ دینی وتہذیبی شناخت کے تحفظ کے لیے ایک الگ سیاسی نظام کا مطالبہ کیا۔ان کے مطابق نظریۂ پاکستان اور جدید لادینی مغربی تصورات کے درمیان بنیادی فکری فرق موجود تھا، جبکہ تحریک پاکستان کی اساس دو قومی نظریے پر قائم تھی۔ان کے نزدیک پاکستان کے بعد پیدا ہونے والی بعض مشکلات کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ریاست کے بعض مقتدر طبقات تحریک پاکستان کے نظریاتی محرکات سے پوری طرح ہم آہنگ نہ رہے اور جدید مغربی سیاسی تصورات کو پاکستان کے نظام میں غالب کرنے کی کوشش کی گئی، جس کے نتیجے میں نظریاتی اور عملی سطح پر کشمکش پیدا ہوئی۔

---

[19] محمود احمد غازی، محاضرات سیرت، ص 299-298

AL-AASAR Journal
Vol. 3, No. 1 (2026)
Quarterly Research Journal
Online ISSN: 3006-693X
www. al-aasar.com
Print ISSN: 3006-6921

یہی پس منظر ہمیں 1951ء میں مختلف مکاتب فکر کے علماء کی طرف سے پیش کیے گئے 22 متفقہ دستوری نکات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان نکات کی اہمیت اس لیے بھی نمایاں ہے کہ انھوں نے پاکستان کے آئینی مستقبل کے حوالے سے مختلف دینی و فکری حلقوں کو ایک مشترکہ دستوری تصور پر جمع کرنے کی کوشش کی۔ ان میں حاکمیتِ الٰہی قرآن و سنت کی بالادستی، قانون کی حکمرانی، شہری حقوق کا تحفظ، مسلم و غیر مسلم شہریوں کے حقوق، عدلیہ کی آزادی، شورائیت، ریاستی سربراہ کا احتساب، قومی وحدت اور ریاستی نظم جیسے اصولوں کو بنیادی حیثیت دی گئی۔ یوں 22 نکات کو صرف ایک تاریخی دستاویز کے طور پر دیکھنا کافی نہیں بلکہ انہیں اس اجتماعی کوشش کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے جس میں علماء نے ریاست پاکستان کے اسلامی، آئینی اور اجتماعی کردار کے بنیادی خدوخال واضح کرنے کی کوشش کی۔

ریاستِ پاکستان کے استحکام کے لیے موجودہ دور میں بھی ضروری ہے کہ آئین اور قانون کی بالادستی کو عملی زندگی میں مؤثر بنایا جائے۔ ریاستی اداروں کے اختیارات میں آئینی توازن، شہریوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ، اقلیتوں کے جائز حقوق کی ضمانت، عدل و انصاف کی فراہمی، معاشی مواقع میں انصاف، سیاسی برداشت اور قومی وحدت ریاستی استحکام کے اہم تقاضے ہیں۔ اسی طرح مختلف صوبوں، علاقوں، طبقات اور شہری گروہوں میں یہ احساس پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ ریاستی نظام کے برابر کے شریک ہیں۔ جب شہری ریاستی اداروں کو منصفانہ ذمہ دار اور قانون کے پابند سمجھتے ہیں تو ریاست کے ساتھ ان کا اعتماد مضبوط ہوتا ہے اور یہی اعتماد کسی بھی ریاست کے داخلی استحکام کی بنیاد بنتا ہے۔ اس تناظر میں ریاستِ پاکستان کے استحکام کو صرف حکومت کے استحکام کے مترادف قرار دینا درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ حکومتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں، لیکن ریاستی ادارے، آئینی اصول، قانون، شہری حقوق اور قومی وحدت ریاست کے مستقل عناصر ہوتے ہیں۔ اس لیے ریاستی استحکام کا تقاضا یہ ہے کہ سیاسی اختلاف کو ادارہ جاتی تصادم میں تبدیل نہ ہونے دیا جائے، آئینی حدود کا احترام کیا جائے، قانون کا نفاذ بلا امتیاز ہو اور ریاستی معاملات میں ذاتی یا گروہی مفادات کے بجائے قومی مفاد کو ترجیح حاصل ہو۔

بالآخر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ریاست کا استحکام آئین کے مؤثر نفاذ، قانون کی بالادستی، عدل و انصاف، شہری حقوق کے تحفظ، ذمہ دار حکمرانی اور قومی یکجہتی کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے 31 علماء کے 22 متفقہ دستوری نکات آج بھی ایک اہم تاریخی و فکری سرمایہ ہیں۔ ان نکات میں موجود اصولوں کو موجودہ آئینی نظام کے تناظر میں علمی اور تحقیقی انداز سے سمجھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ان میں ریاستی نظم، قانون کی بالادستی، شہری حقوق، شورائیت، عدل اور قومی وحدت جیسے ایسے بنیادی تصورات موجود ہیں جو کسی بھی مستحکم ریاست کے لیے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ اگر ان اصولوں کو موجودہ آئینی تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے عملی زندگی میں مؤثر بنایا جائے تو یہ پاکستان میں آئینی استحکام کے ساتھ ریاستی استحکام، قومی یکجہتی اور عوامی اعتماد کے فروغ میں بھی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

نتائج تحقیق

1) قراردادِ مقاصد (12 مارچ 1949ء) پاکستان کی پہلی باقاعدہ آئینی و نظریاتی دستاویز ثابت ہوئی جس نے مستقبل کے دستور کی بنیادی سمت متعین کی۔
2) مختلف فقہی مکاتب فکر کے علماء کا ایک دستوری تصور پر اتفاق رائے پاکستان کی آئینی تاریخ میں بین المسالک ہم آہنگی کی ایک منفرد مثال ہے۔

AL-AASAR Journal Vol. 3, No. 1 (2026)
Quarterly Research Journal Online ISSN: 3006-693X
www. al-aasar.com Print ISSN: 3006-6921

3) 1956ء،1962ء،اور 1973ء کے دساتیر میں مختلف سیاسی تبدیلیوں کے باوجود قراردادِمقاصد کے بنیادی اسلامی اصول کسی نہ کسی صورت برقرار رہے، جس سے اس کی مستقل آئینی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

4) بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹس،پارلیمانی مباحث اور علماء کی سفارشات نے اسلامی آئینی فکر کی تشکیل اور دستور سازی کے ارتقا میں مؤثر کردار ادا کیا۔

5) تاریخی شواہد سے واضح ہوتا ہے کہ قراردادِ مقاصد اور بائیس نکات نے پاکستان کے اسلامی جمہوری اور آئینی تشخص کی تشکیل میں بنیادی اور دیرپا اثرات مرتب کیے، جن کی اہمیت آج بھی آئینی مباحث میں برقرار ہے۔

سفارشات

- آئینی شعور کو عملی ریاستی رویے میں تبدیل کیا جائے۔
- 22متفقہ نکات کو تاریخی دستاویز کے بجائے فکری رہنمائی کے طور پر دوبارہ زیر مطالعہ لایاجائے۔
- ریاستی استحکام کے لیے قانون،عدل اور قومی وحدت کو بنیادی ترجیح دی جائے۔